خالدہ حسین: جدید اُردو افسانے کی ایک منفرد آواز

عبدالرشید میر

تلخیص: جدید افسانے کو ایک منفرد اور موثر بیانیہ میں پیش کرنے میں کئی افسانہ نگاروں کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جن میں خالدہ حسین کا نام بھی شامل ہے۔ اُنھوں نے موضوعی اور ہیئتی سطح پر اپنے اختراعی تخلیقی ذہن سے جدید اسلوب اور تکنیک کے ساتھ ساتھ زبان کے استعاراتی اور علامتی برتاؤ سے افسانہ نگاری میں اپنا ایک تشخص قائم کیا ہے۔ خالدہ حسین کے یہاں اگر چہ عورت موضوع ہے؛ لیکن اُنھوں نے عورتوں کے مسائل کو ایک نئے اور منفرد زاویے کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے اُن کے یہاں عورتوں کے روایتی مسائل نئے پہلوؤں کے ساتھ پیش ہوئے ہیں؛ جس نے خالدہ حسین کے یہاں موضوعات میں ایک نئی اور تازہ روح پھونک دی۔

کلیدی الفاظ: جدید افسانہ، جدید اسلوب و تکنیک، نئے موضوعات، عورتوں کے مسائل۔

خالدہ حسین کا شمار جدید افسانہ نگاروں کے صف اوّل میں کیا جاتا ہے۔ موضوع ومواد، ہیئت واسلوب اور جدید تکنیکوں کو برتنے کے متنوع تجربات سے ان کے کارنامے اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ خالدہ حسین جدید دور کی ان مصنفین میں شامل ہیں جو جدید اردو افسانہ کے لیے سرمایہ افتخار رہی ہیں۔ اپنی انوکھی وضع و منفرد موضوعات کے تئیں افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ کر بہت جلد ہی اچھا فاصلہ طے کیا۔ جدید افسانے میں علامتی، استعاراتی، اساطیری رنگ وآہنگ کے ساتھ لکھنے والی

ایک نمایاں خاتون کی حیثیت سے سرفہرست رہی ہیں۔خالدہ حسین کے کئی افسانوی مجموعے یکے بعد دیگرے منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں ''پہچان'' ۱۹۸۰ء، ''دروازہ'' ۱۹۸۴ء، ''مصروف عورت'' ۱۹۸۹ء، ''ہیں خواب میں ہنوز'' ۱۹۹۵ء، ''میں یہاں ہوں'' ۲۰۰۵ء قابل ذکر ہیں۔پھر چونکہ خالدہ حسین کا کہنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو محسوس کروانے کے لئے لکھتی ہیں:

> ''جب میں اپنے آپ کو محسوس کرنا چاہتی ہوں تو لکھتی ہوں۔کہانی لکھنے کا عمل میرے لیے اپنے وجود کا رشتہ قائم رکھنے کی کوشش ہے۔ان دونوں دنیاؤں کے ساتھ جو میرے اندر اور باہر بہتی ہیں اور یوں مسلسل بہتی ہیں کہ دونوں کے بہاؤ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے چلے جاتے ہیں۔'' [۱]

جدید دور کے افسانہ نگاروں نے ذات اور اپنی شناخت کی پہچان، خوف وڈر، مایوسی وتشویش، بیگانگی و بے سمتی، ہجرت وسفر، وجود وآزادی، ہجرت کے بعد اپنے وجود ودر در کی ٹھوکریں، شہری زندگی میں معاشی حالات کو سدھانے کے جتن میں انسانیت کو مسمار کر کے اپنی معاشی حالات کو مضبوط کرنے کی کوشش وغیرہ کو خاص طور پر اپنے افسانوں میں برتنے کی سعی کی۔جدید افسانے کے دور میں ان موضوعات ومسائل کو اہمیت دی گئی اور ضرورت کے مطابق مصنفین نے اپنے افسانوں میں جدید تکنیکوں کے ساتھ ان موضوعات کو برتا بھی۔خالدہ حسین کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پہچان'' کے نام سے ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آیا۔''اِک بوند لہو کی'' مجموعے کا ایک بہترین افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔افسانے کے کرداروں میں فاروق، امجد، ناہید ظہیرالدین، ابّا میاں، ماں، راوی شامل توجہ ہیں۔افسانے کا مرکزی کردار اپنے آس پاس کی چیزوں سے بیزار ہو کر اپنے وجودی مسائل کی گھتیوں کو سلجھانے کی سعی کر رہا ہوتا ہے چاروں اور اس کو تنہائی کا کھرا دکھ، خوف، کائنات کی تمام چیزوں کی سائیں سائیں محسوس ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔وہ اپنے وجود کے احساس سے بے گانہ ہے اور اپنے ہونے کے احساس کو جیسے فراموش نہیں کرنا چاہتا

بلکہ اپنے آپ کا جائزہ لینا چاہتا ہے اس کے لئے وہ دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤس، کالج اور شاہ صاحب کے پاس جا کر لوگوں کی بھیڑ میں رہ کر بھی آتا ہے اور وہاں تسکین پانے کی سعی کرتا ہے مگر سب ناکام کوششیں رہ جاتی ہے آخر تک وہ خود کو تنہائی کا کھرا دکھ، خوف، ڈر اور اپنے ہونے کے احساس سے بے گانہ سا ہو کے رہ گیا ہے۔ افسانے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''اب میں امجد فاروق۔ نسیم گیلانی اور اسد حمید کے ساتھ کافی ہاؤس میں بیٹھا اپنے دل کی دھڑکن سنتا اور کنپٹیوں میں اُبلنے والے لہو کی تپش محسوس کرتا رہتا اور بے شمار لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا۔ ان لوگوں کو بھی جو وہاں نہ آتے مگر کہیں تھے۔ کسی گھر میں کسی سڑک پر ،اور میں وہ انسان بھی تھا جو وہاں نہیں تھا، کیونکہ وجود محض ایک ہے، خواہ کہیں بھی ہو۔ اس وقت بھی کہیں سوکھی گھاس میں چیونٹیاں اپنا رستہ ڈھونڈ رہی تھیں اور پرندوں کے سینے میں دل ایک ہی انداز سے دھڑک رہے تھے اور وجود کا احساس چمکتی دُھوپ بن کر کائنات پر پھیلا تھا۔ وجود کا احساسِ محض جس کے بعد اندھیرا تھا اور سکوت۔''۲

افسانہ میں فاروق کی موت سے راوی کو کچھ وقت تک جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے مگر بعد ازاں اس کو احساس ہوتا ہے کہ موت ایک بڑی حقیقت ہے موت کا سانحہ آدمی کے اپنے وجود سے وابستہ ہے میری موت صرف میری موت ہے، کسی دوسرے کی نہیں، کیونکہ یہ آدمی کی زندگی کا وہ لمحہ ہے، وہ حقیقتاً و خالصتاً اس کا اپنا ہے اور اس میں وہ تنہا ہے پھر راوی اپنے آپ کو فاروق سمجھ کر یہ جملے دہراتا ہے۔

> ''میں فاروق ہوں، میں فاروق ہوں، وجود کی حدیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی تھیں، یہاں لا انتہا تنہائی تھی مگر تنہائی کا کوئی خوف، کوئی دکھ نہ تھا، خوف بھی مر چکا تھا۔ موت کا خوف بھی اور اس کے بعد کچھ

بھی نہ تھا۔ایک مسلسل، ابدی انتہا سامنے پھیلی تھی۔''۳

اس طرح وجودیت میں موت کا تصور بھی بڑا ہی شاندار اور ایک حقیقی شے کے مانند ہے جو انسان کو آزادی اور شناختِ ذات عطا کرتا ہے۔حیات عامر حسینی نے ہائیڈیگر کے حوالے سے موت کے صحیح تصور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''موت کے صحیح تصور احساس کے بعد آدمی چیزوں کا غلام نہیں بنتا، بلکہ اپنی حقیقت کی شناخت کر لیتا ہے۔اس طرح موت آدمی کو آزادی اور شناخت ذات جیسی دوز بردست حیثیتیں عطا کرتی ہے،اور آدمی وہ فیصلے کرتا ہے، جو اس کے اپنے ہوتے ہیں فیصلے کی قوت کو ہائیڈیگر موت کی جانب آزادی کا نام دیتا ہے۔''۴

خالدہ حسین کے افسانوں میں کرداروں کی نفسیاتی کیفیات وداخلی جذبات وخیالات کے ساتھ ساتھ خارجی معمولات وتاثرات بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔مگر عورتوں کی اونچ نیچ اور ان کا برتاؤ گھر کے افراد خانہ کے ساتھ، خاص کر بچوں کے ساتھ ان کا رویہ دلچسپی سے خالی نہیں اور زبان وبیاں خاص طور پر عورتوں کی زبان پر انہیں خاصاً عبور حاصل ہے اور پھر عورتوں کے حالات، جذبات، بات چیت وبچوں کی پرورش وپرداخت خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔''شہر پناہ'' میں بچوں کی نفسیات وان کے ذہن کے مختلف حالات وگوشوں کا ایک اچھا مرقع کھینچا ہے۔اس کے علاوہ خالدہ حسین کو مسلمانوں کی متوسط گھریلوں زندگی کے نشیب وفراز کا نقشہ کھینچنے میں بڑی مہارت حاصل ہے کیونکہ جہاں ایک طرف ان کی مضبوط بنیاد ڈالنے والی اردو افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک بڑی افسانہ نگار عصمت چغتائی کا ہاتھ رہا ہے وہیں بعد میں کئی خواتین افسانہ نگاروں کے ساتھ خالدہ حسین نے بھی اس کی بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنے افسانوں میں پُرکشش تصویریں کھینچنے کی سعی کی۔افسانہ ''مُنی'' میں گرچہ سعیدہ کو اپنے پُرانے گھر یعنی مسلم گنج کی یاد بہت ستاتی ہے کیونکہ ان کے وجود کا احساس کہی نہ کہی اُسی مسلم گنج والے مکان میں بس گیا ہے گرچہ بعد ازاں انہوں نے وہاں سے ہجرت بھی کی ہوئی ہے مگر وہ اپنی بیتی یادوں کو اپنے سینے سے دور

نہیں کر پاتی ہے گر چہ اس کے علاوہ وہ گھر کے دیگر افراد خانہ کو بھی اس کا احساس ہے مگر سعید کو اس کا احساس حد سے زیادہ تھا۔اس احساسِ وجود و ذات کی شناخت کے لیے وہ تمام مراحل کو سر کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔افسانہ سے یہ تصویر ملاحظہ کیجیے:

''تمام رستہ، پاگلوں کی طرح دھڑکتے دل کی دھم دھم کو دبا کر، بڑی اُونچی آواز میں اسے حاجن مائی کو یقین دلانا پڑا کہ وہاں سہیلی سے ملنے قطعاً نہیں جا رہی۔۔۔محض اس مکان سے ملنے جا رہی ہے اور شاید اپنے آپ سے بھی۔۔۔یہاں پہنچ کر وہ پھر چکرا گئی۔اور جب اس نے وہاں قدم رکھا تو دھوپ میں سانس لیتی اس گنجان گلی نے اس کو نگل لیا۔''۵

افسانے کا غائر مطالعہ کیا جائے تو عورتوں کے ساتھ جو ظلم و زیادتی سماج میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ بھی افسانے میں بیان کیا گیا ہے کہ سماج میں ہر جگہ عورتوں کو مظلوم و محکوم رہ کر دبایا جاتا ہے اور انہیں اپنے وجود کے احساس سے بھی کبھی کبھی نامانوسیت کا سا شائبہ ہوتا ہے۔وجودی مسائل و ذات کی شناخت کا احساس افسانے میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔وہیں افسانہ ''سواری'' ایک علامتی و داستانی انداز کی کہانی ہے جو خالدہ حسین نے اپنے بچپن میں گلی کوچواں میں دیکھا ہے مونسپل کمیٹی کی ایک گاڑی کو شعوری طور پر افسانوی قالب میں پیش کیا گیا ہے۔جوان کے بچپن کے شعور و غیر شعور کے بہت سے گوشوں سے ہو کر کہانی کے قالب میں بیان ہوئی ہے۔مرزا حامد بیگ، خالدہ حسین کی برتی جانی والی نفسیاتی کیفیتوں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''زندگی کی پیچیدگیوں اور اس میں روندے جانے والی نفسی کیفیات پر خالدہ حسین کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ قرۃ العین حیدر کے بعد یہ خوبی کسی خاتون افسانہ نگار کے حصے میں نہیں آئی۔''۶

جدید افسانہ نگاروں کے یہاں کہانی صرف ایک موضوع کے تئیں یا صرف ایک ہی کردار، زندگی کے ایک واقعہ کے اردگرد نہیں گھومتی بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کر

کے زندگی کے متنوع تجربوں کو سمونے کی سعی کر رہے ہیں۔''دھوپ چھاؤں'' میں بہت سے واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں' گھر میں روفی بھائی کا حیران کن طرز عمل، درختوں سے ڈھکے گھر سے سانپ کا نکلنا، مریم آپا کا حیرت انگیز کردار،، ابّا، اماں کے غیر معمولی واقعات وتاثرات۔کرداروں کی نفسیاتی کیفیتوں کو مختلف ومتنوع تجربات کے سمیت بیان کیا گیا ہے۔''اب یہ بڑی مصیبت تھی کہ جو واقعہ ہونا ہوتا اس کے پیچھے ہی ہو چکتا۔اب وہ لاکھ بھاگ دوڑ کرتی کچھ بھی نہ دیکھ پاتی، دراصل اس کے پیچھے اتنا کچھ ہو چکا تھا کہ اب اس کے سامنے کچھ ہونا ممکن ہی نہ تھا۔آخر واقعے کوئی وہ، دودھ بھرا پیالہ تو تھے نہیں کہ ختم ہی نہ ہوتے۔اپنے آگے پیچھے، چاروں طرف، وہ جہاں بھی دیکھتی بھید ہی بھید بکھرے نظر آتے۔''۷

یہ زندگی دُھوپ چھاؤں کی طرح وقوع پزیر ہوتی ہے یعنی زندگی کے اس سفر میں مصیبتیں بھی دیکھنی پڑھتی ہے اور خوشی کے مناظر سے بھی لطف اندوز ہونا پڑھتا ہے مگر یہ سارے واقعے دودھ بھرے پیالوں کی طرح ختم بھی ہوجاتے ہے گویا زندگی کے اس سفر میں خوشی اور دوکھ دونوں سے انسان کا سابقہ پڑھتا ہے۔وہیں افسانہ''دھوپ چھاؤں''میں علامتی انداز اپنایا گیا ہے،مختلف طرح کی وسوسوں کے باوجود تصویریں ادھوری رہ جاتی ہیں۔کہانی میں دیو مالائی اور اساطیری عناصر کے امتزاج واضح طور پر دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔افسانہ''زمین'' سے پہلے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''یوں خوف وہ شروع ہی سے کھاتی چلی آئی تھی۔اندھیرے اور تنہائی کا خوف لوگوں کے غائب ہونے، مرجانے کا اندیشہ طرح طرح کے حادثوں اور اپنے سے بہتر نظر آنے والے تمام انسانوں کا ڈر اور اس دنیا میں سب کے سب اس سے بہتر تھے۔عجب دنیا تھی۔''۸

افسانے میں شیریں ایک عجیب وغریب مخمصے میں گرفتار ہوئی ہے وہ اپنے اندروں کو جانے کی کوشش میں وہ دن رات بے چین رہتی ہے اسے نہ دن کا آرام اور نہ ہی رات کا

سکون اس کر میسر آتا ہے، اپنے آپ کو جانے کی سعی میں دن بہ دن وہ گھلتی جارہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی تنہائی و اندھیرے کے خوف سے ڈرتی ہے تو کبھی اپنے آپ کو عذاب دوزخ میں مبتلا پا کر بے چین رہتی ہے۔ مگر آخر میں ایک دانا شخص کا آ کر اس کا دل بہلانا اور اس کو متنبہ کرنا کہ اس کو جس زمین کی تلاش کرنی چاہیے وہ انہیں اپنے اندر نہیں مل سکتی۔ اس کے غائب ہو جانے سے وہ ایک بار پھر اُکتاہٹ کا شکار ہو کر ایک عجیب سی اُلجھن کی شکار ہو کر ایک بار پھر وہ شخص آ کر شیریں سے کہتا ہے کہ 'شیریں میں نے اب جانا کہ ہم زمین سے خوف کھاتے ہیں۔' زمین کی تلاش میں بے چین ہو کر رہنا اور زمین کو پانے اور اپنے آپ کو دلاسا دینے کی سعی کرنا کیا یہ آخری جائے پناہ یعنی زندگی کی ناپیداری و بے ثباتی کا ذکر تو نہیں، کیونکہ اس دنیا میں انسان کو اندر کے خوف اور تنہائی نے بے چین کر کے رکھ دیا ہے۔ افسانہ ''الاؤ'' بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ افسانے میں 'سلیمہ' اپنی سہلیوں کے ساتھ بیٹھی اس کے اولاد نہ ہونے کے غم کو دور کرنے کی سعی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو دلاسا دے رہی ہیں کہ وہ اس تنہائی میں پناہ بھی تو لے سکتی ہے، تم نے بہت جلد ہتھیار کیوں ڈال دیئے، تنہائی تو بہت حفظ و امان دینے والی چیز ہے۔ الغرض خالدہ حسین نے ایک عورت کی تمام خوشیوں و مصائبوں کو بیان کر کے اس کے اندر کے جذبات و خیالات کو زبان دے کر اسے اُمید کا دامن تھامے رکھنے کی تلقین کرے ہوئے انہیں سمجھایا کہ خوف زدہ ہونے سے بہتر ہے کہ وہ تنہائی کو ہی اپنی محفوظ و اپنا دوست مان کر چلے تا کہ ان کے مصائب میں کچھ تو کمی آجائے۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے خالد حسین کے حوالے سے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''ہم حیران ہوتے ہیں کہ خالدہ حسین کے صوفیانہ انداز نظر نے کیسے معمولی چیزوں کو غیر معمولی بنا دیا ہے۔ روزمرہ زندگی کے معمول کے واقعات کتنے تعجب خیز اور پر اسرار نظر آنے لگیم سے لبریز ہیں۔ فقط لمحہ بھر پہلے جو چیزیں حقیر اور بے معنی تھیں اب کیوں کر نئے اور گہرے مفہو ہو گی ہیں۔''۹

''نامہ بر'' خودکلامی کی تکنیک میں تحریر کیا گیا ہے۔ جہاں راوی کو اپنے اندر کی

تحریروں سے شناسائی ہوتی ہے اور پیغام کو پڑھ کر اس کو محسوس ہوتا ہے یہ تحریر اس کے اندر سے وجود میں آنے کے بعد وجود پا چکی ہیں۔ رات کے پہرے میں یہ خیالات لفظوں کی قید سے باہر اور ذہن میں محفوظ رکھنے سے قاصر ہے۔ افسانے میں انسانوں کے اندر پائے جانے والے جانوروں کی منفی خصوصیات جیسے ناگ، گیدڑ، کتا وغیرہ کی نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، گویا منفی خصوصیات کو بیان کر کے انسان کی نفسی و منفی خواہشوں کو بیان کیا گیا ہے۔ گویا ان باتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں کرداروں کے ذریعے اپنے ہونے والے وجود، خودشناسی، بیزاری، تنہائی، انتقام، غصہ، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، و گمشدہ معنویت کا احساس جیسے مسائل کو بہت شدت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ جدید دور کے مرد افسانہ نگاروں کے دوش بدوش اگر کوئی خاتون افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کے بعد ہمیں نظر آتی ہیں یعنی فنی، موضوعاتی، اسلوبی و تکنیکی، ہر پہلوؤں کے اعتبار سے تو وہ صرف خالدہ حسین ہی ہوسکتی ہیں۔ جہاں ایک طرف انہوں نے جدید تکنیکوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے جدید موضوعات کو پیش کرنے میں اپنی تمام تر تخلیقی کاوشوں کو بروئے کار لایا وہیں عورتوں کے مسائل کو ایک عورت کے بطور بھی پیش کر کے جدید افسانہ نگاروں کی صف میں اپنے دیرپا نقوش ثبت کیے ہیں کہ کس طرح سماج میں عورتوں کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھ کر اس کے مقابلے میں مرد کو افضل سمجھا جاتا ہے۔ ''دروازہ'' میں عالموں، مفکروں اور دانشوروں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ کس طرح وہ علم کے میدان میں اپنی ذہانت کے بل پر بڑے عالم و مفکر بن گئے ہیں مگر عمل میں وہ صفر کے برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ گویا سماج میں علم حاصل کر کے اپنے آپ پر فخر محسوس کرتے ہیں مگر عمل سے وہ عاری ہو چکے ہیں۔ افسانہ ''دروازہ'' سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''کبھی تخلیق کار بھی تنہا ہوا ہے۔ ایک دنیا اس کے اندر آباد ہوتی ہے۔ تم کیسے رجعت پسند ہو۔ اس عورت کا تذکرہ کرتے ہو جو تمہاری بات تک نہ سمجھ پائے۔ وہ جس کے پاس سے ایک حیوانی کنگ غرق کر دینے والے لمحے کے سوا تم کچھ نہ پا سکو، وہ لمحہ جس کا

تمام زندگی کے ساتھ کوئی ربط، کوئی رشتہ نہ ہو۔ کاش مجھے وہ عورت مل جاتی جو میرے ذہن میری روح کے دروازے پر دستک دے سکتی۔''۱۰

تخلیق کار کے اندر کا شخص ہر وقت کچھ تخلیق کرنے کے لیے اُکساتا ہے بلکہ اپنی شناخت واپنا وجود اُسی تخلیق کے ذریعے بھی قائم ودائم رکھنے کی سعی میں ہر دم کوشش کرتا رہتا ہے اور اس کو اندر سے بیقرار کر کے دکھ دیتا ہے۔ کیونکہ ذہنی وجذباتی سفر میں یہ تخلیق کار کے ساتھ رہا، اب تخلیق کار کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر کے جذبات وخیالات کا اظہار بڑے ہی تواتر کے ساتھ کرا سکیں۔ راوی پہلے ایک ایسی جگہ قیام کیے ہوئے تھی جہاں لوگ علم وادب سے وابستہ ہی نہ تھے۔ جہاں علم کا فقدان اور کھیتوں، دوکانوں سب جگہوں پہ جہل پہل تھی، مگر اب راوی دوسرے شہر میں آ کر رہتی ہے یہاں، مرد وزن، پیر و جوان ہر ایک مطالعے میں غرق، بات بات میں علم ودانش کی بہتات اور ادبی محفلیں جمی ہوئی تھی، مگر گھروں اور بازاروں میں رونق کی کمی اور ساتھ ہی خوراک کی بھی کمی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ تبھی راوی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ''صاحبِ علم ہونے سے صاحبِ عمل ہونا بہتر ہے مگر پھر یہ مسئلہ ہے کہ عمل کے لیے علم کا ہونا لازمی ہے۔ تو ہر شخص اسی دشت میں سرگرداں ہے۔''

''مصروف عورت'' میں فن کار کی مصروفیات ودیگر کاموں کے تئیں اس کی روداد ہیں۔ جو کام اس کو کرنا ہے جس سے اس کو دلی مسرت حاصل ہوجاتی وہ کام وہ نہیں کر پا رہیں ہیں، مگر اس کے باوجود وہ آخر تک اس کوشش میں رہتی ہے کہ وہ کام انجام دئے جو بطور فن کار کے دینا ہے۔ اس کے لئے اس کو وقت وفرصت درکار ہے جو کہ اس کو آخر تک نصیب نہیں ہو پاتی، فن کار تو اظہار چاہتا ہے، آزادی کے ساتھ اپنے جذبات وخیالات کو قلمبند کر کے اپنی اندرونی حالات وذہنی کیفیات کو بیان کرنا چاہتا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ مصنفہ نے فن کاروں پر لگی پابندیوں کی طرح اشارہ کیا ہے اور ان کا نوحہ بیاں کر کے اپنی بات کی اور ہماری توجہ مبذول کرانا چاہتی ہے کہ فن کار اپنے خیالات کا اظہار آزادنہ طور پر کرنا چاہتے ہیں ان پر کسی قسم کی سیاسی وسماجی و دیگر طرح کی پابندی عائد نہیں ہونی چاہئے۔ افسانے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''دراصل بے حد مصروف ہستیوں کے لئے کام کے درمیانی وقفے سب سے زیادہ گھمبیر ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے تخلیق کاروں کے یہاں آپ کو ریاضت کے ایسے دور نظر آئیں گے، ایک مفروضہ ثابت کرتے ہی نہیں جب یہ احساس آن لیتا ہے کہ اب اس کے امکانات ختم ہوئے تو وہ نئے امکانات کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔۔۔۔میرے طاقتوں میں سے رفتہ رفتہ وہ چہرے غائب ہونے لگے اور وہاں دھول جمنے لگی۔اپنے خالی طاق دیکھ کر مجھے خیال آیا۔۔۔تو کیا وہ وقت آنا پہنچا؟ کیا میں نے واقعی اس جنگل کو پار کرلیا؟ اور اب بلاآخر وہ میرے سامنے ہو گا۔وہ کام جو دراصل مجھے کرنا تھا۔'' ۱۱

مصروف عورت دن بھر مختلف کردار نبھانے والی ایک فنکار کا نوحہ ہے، جو اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں تخلیقی وقفے کے لیے ایک موقعے کی کھوج میں ہے، جہاں وہ نئے امکانات تلاش کر سکے، لیکن انہیں درپیش مسائل کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ وہ وہی کام نہیں کر ہو پاتا ہے جسے وہ اپنی زندگی کا اصل مقصد سمجھتی ہیں۔

شہری زندگی کی بے گانگی، پیاور خلوص سے کوسوں دور واس کو پانے کی تمنا، اپارٹمنٹوں کی زندگی نے انسان کو بھی ہمدردی وخلوص کے محدود دائرے میں باندھا کر کھ دیا ہے۔ان شہروں میں عورتوں کی جستجو ومحنت کو بھی دیکھا جاسکتا ہے، گھر بھر کی زندگی کو نبھانے وسنوارنے میں ان شہروں میں عورتوں نے اپنے وجود تک کو کھو دیا ہے وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے کتنی جتن کرتی ہیں مگر ہر لمحہ ان کی آنکھوں میں سیاہ حلقے ہی پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔شہروں کی بے گانگی و اپارٹمنٹوں کی زندگی کے حوالے سے افسانہ ''آگ'' سے یہ اقتباس ملاحظ کیجئے :

''ایک ہی زینے پر رہنے والے آتے جاتے ضرور کوشش کرتے کہ دروازوں کے اندر کی ایک آدھی جھلک دیکھ پائیں۔مگر ایک

دوسرے سے ملاقات کا وقت نکالنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔۔۔کبھی
آتے جاتے یا محض اپنے اپنے دروازے کی دہلیز میں کھڑے
کھڑے وہ ایک دوسرے کا حال واحوال پوچھ لیتیں۔''۱۲

خالدہ حسین سماج میں عورتوں کے وجود وان کے مسائل کا احاطہ کرنا چاہتی ہیں سماج میں عورتوں کے ساتھ ہو رہے ظلم و جبر نے انہیں چاروں اور گھیرے رکھا ہے ان کو کہیں بھی سکون و آرام میسر نہیں ہو پاتا، گرچہ وہ نڈھال ہو چکی ہیں مگر جینے کی آس و اچھائی کی اُمید اُنہوں نے ابھی تک نہیں چھوڑی ہے، قریب ہے کہ یہ تمام قدغنیں ایک اُونچے محل کی طرح مسمار ہو جاتی ساتھ ہی ان کا مقام وقد بھی اس ظلم کے خاتمے سے اونچا ہوگا۔ کہانی کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین مختلف طرح کی کیفیات سے ہو کر گزارتے ہیں۔ افسانہ 'ایک دفعہ کا ذکر ہے' میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''تب پہلی بار اس کو احساس ہوا کہ وہ عورت ہے اور شب چراغ
حاصل کرنا تو مرد کی روایت ہے۔ ہاں یہ ہے کہ اس کی گردن کا لہو
قطرہ قطرہ گر کر یاقوت بن سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے بھی گردن کا
کٹنا لازمی ٹھرتا ہے۔ جب شہزادیوں کی گردنیں دیوتن سے علیٰحدہ
کرتے ہیں تو وہ عظمت کی علامتیں بن جاتی ہیں مگر ایک عام معمولی
عورت کی گردن اس کے جسم سے جدا ہو جائے تو اس کی گردن سے
ٹپکنے والا قطرہ قطرہ لہو یاقوت نہیں بنتا۔''۱۳

خالدہ حسین نے سماج میں عورتوں کے وجود وان کے مسائل کی عکاسی فنکارانہ انداز میں کر کے اپنے اندر کی عورت کا احاطہ کیا ہے۔ تاکہ موجود انتشار واضطراب والے ماحول میں خود کا وجود باقی رکھ سکیں اور اپنی عورت برادری کا خیال رکھ کر ان کے مسائل ومصائب کا اظہار کر کے ان کے خیالوں کو وسعت بھی بخشنا چاہتی ہیں۔ انہوں نے زندگی کے پیچیدہ مسائل اور انسان کی اندرونی کیفیات کو گرفت میں لیکر اپنی فنکارانہ نظر وموضوع کے تئیں گہرائی و گیرائی کا بھی بیش بہا ثبوت فراہم کیا ہے۔ خالدہ حسین کے گرد و پیش کے سماجی

مسائل اوران کی باریک بینی پر ڈاکٹر انوار احمد رقمطراز ہیں:

''خالدہ حسین کے ہاں گردوپیش میں موجودہ سماجی مسائل کا ادراک ہے مگر اپنے مذہبی احساس کی وجہ سے وہ ایک نظام کے ستائے ہوئے لوگوں کو حضرت سلیمان اور عزرائیل کے قصے سنا کر متعین گھڑی کے جبری طلسم سے مسحور کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔''[۱۴]

شناخت و پہچان کے حوالے سے خالدہ حسین کا افسانہ 'پاسپورٹ' قابل ذکر اہمیت کا حامل ہیں۔ افسانہ 'پاسپورٹ' میں جہاں ایک طرف ڈبو (کتا) کی موت کا واقعہ سامنے آتا ہے یعنی کس طرح تاوجی نے اس کو پالا اور ایک دن اچانک وہ گاڑی کے نیچے آ گیا، وہیں دوسری طرف سلیم کی کہانی بھی متوازن چلتی رہتی ہے، جو اکیلے ہی اپنے ملک سے ترک وطن کر کے یہاں پاکستان میں بس گیا ہے۔ صاف صفائی میں بے حد ماہر اور اپنے کام سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ایک دن اچانک بغیر پاسپورٹ واپس جانا چاہتا ہے۔ دیکھا جائے تو ڈبو اور سلیم میں کتنی مماثلت ہے ڈبو بھی آوارہ ہو کر ایک دن تاوجی کے گھر کے سامنے آجاتا ہے اور پھر تاوجی کے گھر میں ہی رہتا ہے وہیں دوسری اور سلیم اپنے ملک کو چھوڑ کر آیا ہے، اب یہاں اس کی کوئی شناخت کوئی پہچان نہیں ہے تاکہ اس کا پاسپورٹ بن سکے۔

افسانہ ''قرض'' میں ذکی احمد اپنے باپ دادا کی طرح ایک معزز شہری، صاحب اعتبار، بے باک، بے داغ اور حساب میں ہمیشہ پاک رہنے کی سعی کرتا رہا، ایک عمر تک اس کو لگا کہ وہ اپنے باپ دادا سے بھی زیادہ معزز شہری بن گیا ہے مگر ایک روز اچانک کفیل نے اس کو اپنے دیئے ہوئے قلم کو واپس دینے کو کہا، پھر یکے بعد دیگر منور احمد نے دستانے اور رمضان نے ٹوپی جو کہ اس کو یاد ہی نہیں تھا کہ کب اور کہاں سے یہ سب لیا ہوا تھا۔ ابھی تک وہ خود کو ایک معزز شہری سمجھ کر خود کو قرض سے پاک سمجھتا تھا مگر اس کو یہ معلوم ہی نہیں تھا اس کی زندگی قرضوں سے لد پڑی ہے پھر ایک وقت میں اس کو تاریکی نے چاروں اور گھیر لیا۔ اس افسانے کے بارے میں بی بی آمنہ رقمطراز ہیں:

''اس کردار کے ذریعے خالدہ حسین نے اس حقیقت سے پردہ

اُٹھانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے میں ہر شخص کسی نہ کسی صورت
میں کسی کا قرض دار ہے، لیکن اسے احساس نہیں ہوتا۔''۱۵

مشترکہ خاندانی نظام تو ۱۹۴۷ء سے پہلے بہت ہی اعلیٰ و عظیم شے سمجھی جاتی تھی مگر ۴۷ء کے بعد تو جیسے اس کا خاتمہ ہی مشرقی تہذیب میں ہو گیا۔ کس طرح اور کن کن حربوں سے اس کو ختم کیا گیا اور کیا کیا معاملے طے پائے گئے وہ ہم آزادی سے پہلے اور بعد میں خوبی کے ساتھ دیکھتے آئے ہیں۔ افسانہ ''چوکھٹ'' میں مشترکہ خاندان کی تیتر بتر کو بہت ہی اعلیٰ وارفع کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ''گیدڑ کی موت'' افسانے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ جب انسان اپنی زندگی میں ہر جگہ و ہر مقام پر غلط فیصلے لیتا ہے تو نہ صرف اپنی کم علمی بلکہ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں خود کو پست اور بے جا محسوس کرتا ہے اور پھر چونکہ دوسروں کی نظروں میں بھی اس کی وقعت کم ہو جاتی ہے۔ تو وہ اپنی زندگی کا خاتمہ خود اپنے ہاتھوں سے کرنے کی سعی کرتا ہے تا کہ اس کو روحانی و ذہنی سکون میسر ہو سکے۔ 'گیدڑ کی موت' خوف کے موضوع پر لکھی جانے والی ایک بہترین کہانی شمار کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ خالدہ حسین کے افسانوں میں انسانی زندگی کے گوناگوں واقعات کی گونج سنائی دیتی ہے جہاں وہ انسانوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے مختلف رنگوں کے ساتھ بیان کرتی ہے اور جادوں بیانی سے قاری کو بھی دنیا جہاں کے مختلف کیفیتوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ افسانہ ''مایا'' سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''انسان کسی ایک لمحے میں مکمل ہو کر اپنے دیکھنے والے میں جا بستا
ہے محفوظ و مدفون۔ پس چہرے اور وجود اور ہستیاں سب واقعات
میں جو گزرتے چلے جاتے ہیں اور اس لیے دراصل اپنا کوئی وجود
نہیں رکھتے۔ لہذا کائنات اشیاء اور نفوس کا نہیں واقعات کا مجموعہ
ہے۔''۱۶

عورتوں کی بے بسی، مظلومیت و ایک غیر مہذب سماج میں اس کی لاچارگی و بے بسی کی کئی تصویریں دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر بسے ہوئے خوف و ڈر اور کرب کے عناصر

کو پیش کر کے اس کو مزید گہرائی بخشی ہے۔'ایک رپورتاژ، سواری اور پہچان'' میں یہ عناصر واضح طور پر اپنی شناخت کرواتے ہیں۔اسی طرح 'چینی کا پیالہ' میں زندگی کی ناپائیداری اور موت کی علامت ہے۔کانچ ایک ایسی چیز ہے جو کہ فوراً ٹوٹ جاتی ہے،لہٰذا اس میں شکست وریخت اور بے بسی کے جوہر کو ظاہر کیا گیا ہے۔خالدہ حسین کے افسانوں میں کرداروں کی خارجی وداخلی نفسیاتی عناصر بھی اپنے جوبن پر دیکھائی دیتے ہیں۔وہ انسانوں کے داخلی کیفیات و باطنی تجربات اوراس کے نتیجے میں ہونے والی شکست وریخت کو اپنی کہانی کے قالب میں ڈھال لیتی ہیں اوراس کے لیے علم نفسیات کی اصطلاحات شعور ،تحت الشعوراورلاشعور کے علاوہ جدید تکنیکوں سے بھی کام لیتی ہیں۔افسانہ'' گنگ شہزادی اور پیار کہانی'' میں انہوں نے عورت کے سماجی کردار کی وضاحت سے متعلق لکھ کران کے سماجی مسائل وان کی انسان دوستی کے عناصر کا بھی اظہار کیا ہے۔بقول ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان :

''خالدہ اصغر اپنے موضوعات عام زندگی سے چنتی ہیں۔روزمرہ کی زندگی میں پیچیدہ سے پیچیدہ تر سچائیاں اور مسائل سر اٹھاتے ہیں۔اسی زندگی میں جو،ان ہونی باتیں ہوتی ہیں وہ معجزات سے کم نہیں ہوتیں۔انھیں سے خالدہ اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتی ہیں اور انھیں اپنی خام یا اصلی شکل میں پیش کر دیتی ہیں۔اس پیشکش میں وہ کسی جانب دارانہ یا جذباتی رویے کو دخل انداز نہیں ہونے دیتیں۔''۱۷

افسانوی مجموعہ'' میں یہاں ہوں'' میں افسانہ'' فن کار'' اپنے موضوعاتی وفنی اعتبار سے قابل توجہ ہیں۔جانوروں پر قابو پا کرانسان انہیں اپنے جی کو بہلانے کے لیے استعمال کرتے ہے وہیں افسانے میں یہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ جدید دور کے اس ترقی یافتہ زمانے میں کس طرح ہم اپنی تہذیب وثقافت کو اپنے پیروتلے روندڈالتے ہیں۔جانوروں کی روح کو قابو میں کر کے جہاں ایک طرف اپنے وحشی ہونے کو ظاہر کر رہے ہیں وہیں دوسری

طرف ان جانوروں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کر کے اپنے انسان ہونے پر فخر کرتے ہیں کہ ہم ان جانوروں کی روح کو قابو میں کر کے ان سے اپنے لئے تفریح کا سامان پیدا کرتے ہیں۔افسانے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''جاہل حیوان نما انسان جن کی قوتِ ارادی پیدائش سے پہلے ہی رہن رکھ دی جاتی ہے۔شاید یہ سب کچھ بھی کسی کے اختیار میں نہیں۔معلوم نہیں بااختیار کب اور کس طرح بااختیار بنا اور بے اختیار کب اور کس طرح اس مقام پر''فائز'' ہوا۔یہ سلسلہ کبھی نہ بدلے گا۔کبھی نہیں بدل سکتا۔بس ہم تہذیب وثقافت کے انم پر ان کی ڈاکومنٹریاں بناتے رہیں گے اور میڈیا لائبریریاں سجتی رہیں گی۔''۱۸

فن کار میں جدید دور کے معاشرے میں انسان ایک مخصوص تہذیب وتمدنی قدروں کی شناخت کھوتے جارہا ہے عصری انتشار کی وجہ سے معاشرے میں بدامنی سے یہ قدریں زوال پذیر ہورہی ہے اور ان کی زوال پذیر پر دراصل ہماری زوال پذیری کا باعث بنتا جارہا ہے۔اس طرح ہم اپنی تہذیب و ثقافت سے بھی ایک طرف ہاتھ دو رہے ہیں۔کیونکہ فن کار کو ہمیشہ اپنی تخلیق کی ہوئی چیز کا بڑا احساس بھی ہوتا ہے اور اس کو وہ نہ صرف اپنی ذات یعنی تخیّل سے وجود بخشتا ہے بلکہ ایک ناقابل فہم تخلیق وروحانی کیفیت سے وہ اپنی تخلیق سے وہ داخلی جذبات وخارجی کیفیت کو صفحہ قرطاس پر بیان کرتا ہے جو کبھی کبھی خاص قاری کے لئے بھی چونکا دینے والی ثابت ہوتی ہے۔ان تحریروں میں بھوک، بیماری، ظلم وجبر، استحصال، سرکشی کے علاوہ روح کو چھیڑنے والی کیفیت وعناصر کی بو باس بھی محسوس کی جاسکتی ہیں۔کہانی میں نفسیاتی عناصر، داخلی وباطنی تجربات اور اس سے پیدا شدہ سوالات ذہن میں گھومتے ہیں۔افسانہ''عجائب گھر'' سے اقتباس ملاحظہ کیجیے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح تخلیق کار نے اپنے ناقابل فہم تخلیقی وروحانی کیفیت کا اظہار کیا ہے:

''ایک نا قابلِ فہم تخلیقی اور روحانی کیفیت میں لکھی جانے والی تحریر کس طرح کس پر اتنی اثر انداز ہوسکتی ہے۔مگر پھر مجھے وہ بہت سی تحریریں یاد آئیں جنہوں نے ایک ثانیہ ہی میں میری دنیا دولخت اور اُلٹ پلٹ کردی تھی۔''۱۹

من جملہ کہا جاسکتا ہے خالدہ حسین نے ایک طرف نہ صرف جدید رجحانات کے موضوعات پر افسانے قلمبند کر کے اپنی فن کارانہ مہارت کا ثبوت دیا بلکہ دوسری طرف انہوں نے عورتوں کے مسائل اوران کی سماجی حیثیت کے دردوغم،روزمرہ کی زندگی کے عام افعال کا تعلق،سماج میں فرد کی نفسی خواہشوں کی اور بھاگنے کا طریقہ کار،ان کی زندگی کی پیچیدگیوں وان کی نفسیاتی کیفیتوں کوگرفت میں لینے کے ساتھ ساتھ شہری زندگی میں سمٹی ہوئی اپنائیت،وجودوشناخت کی جستجو،متوسطہ طبقے کے تعلیم یافتہ کرداروں کی نفسیاتی کیفیات،محبت واخلاقی بیگانگی،کرب وانتشار،بے رحم کائنات میں تنہا آدمی،مرد وعورتوں کی ذہنی تشنگی،بے سمتی،بے بسی کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کر کے جدید افسانہ نگاروں کی ایک منفرد آواز بن گئی۔

○○○

حوالہ جات

۱۔ مرزا حامد بیگ ،اردو افسانے کی روایت ،جلد دوم،ایم آر پبلی کیشنز،نئی دہلی،۲۰۲۰ء،ص:۱۱۲۰

۲۔ خالدہ حسین،مجموعہ خالدہ حسین،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء،ص:۱۲۔۱۱

۳۔ خالدہ حسین،مجموعہ خالدہ حسین،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء،ص:۱۳

۴۔ حیات عامر حسینی،ڈاکٹر،وجودیت،کتاب محل،سرینگر،۲۰۱۶ء،ص:۵۹

۵۔ خالدہ حسین،مجموعہ خالدہ حسین،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء،ص:۳۹

۶ ۔مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت ،جلد اول،ایم آر پبلی کیشنز،نئی دہلی،۲۰۲۰ء،ص:۱۱۸

۷۔خالدہ حسین، مجموعہ خالدہ حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۱۴۳
۸۔ ایضاً، ص:۱۷۳
۹۔فتح محمد ملک، پروفیسر، تحسین وتردید، ثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۴ء، ص:۱۰۳
۱۰۔خالدہ حسین، مجموعہ خالدہ حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۲۲۵۔۲۲۴
۱۱۔خالدہ حسین، مصروف عورت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۶۰۔۵۸
۱۲۔خالدہ حسین، مصروف عورت، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۸۶۔۸۵
۱۳۔ایضاً، ص:۵
۱۴۔انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۰ء، ص:۵۰۱
۱۵۔بی بی آمینہ، خالدہ حسین: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۷ء، ص:۱۱۰
۱۶۔خالدہ حسین، ہیں خواب میں ہنوز، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص:۱۰۱
۱۷۔نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، اردو مختصر افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ، بک وائز ے، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص:۴۴۔۳۴۳
۱۸۔خالدہ حسین، مجموعہ خالدہ حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۵۷۔۵۷۴
۱۹۔خالدہ حسین، مجموعہ خالدہ حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۶۰۱

❑❑❑